مظفر اقبال

ایک مردِ حق آ گاہ کی بصیرت

چنیں دور آ سماں کم دیدہ باشد　　　　کہ جبریلِ امین رادل خراشد
چہ خوش دیری بنا کروند آ نجا　　　　پرستد مومن و کافر تراشد

اقبال نے صبح صادق کے وقت آ نکھ کھولی تھی لیکن شعور کی ابتدائی ساعتوں ہی سے انہیں اس بات کا شدّ ت سے احساس تھا کہ جس فکری، روحانی اور علمی فضا نے ان کی ذات کو اپنے ہونے کی آ گہی بخشی ہے، وہ ایک خطرناک حملے کی زد میں ہے۔ غالبًا پہلے پہل یہ شعور ان کی زندگی کی اوّلین جذباتی اور شعری وابستگیوں کے حوالے سے نمودار ہوا ہو گا لیکن رفتہ رفتہ یہ احساس کہ نہ صرف وہ خود بلکہ تمام ملّتِ مُسلِمَہ غلامی کے کابُوسی اندھیرے میں زندگی کو جیسے تیسے سہہ رہے ہیں، مکمل طور پر ان کے وجود کا جزو بن گیا اور اس ظلمت کو تار تار کرنے کی لگن نے ان کے اندر ایک ایسا در کھول دیا جسے صرف اور صرف اللہ کی رحمت اور ان کے خلوص اور سچائی کا نتیجہ سمجھنا چاہیے؛ یہ دولت نہ تو ہر کسی کو ملتی ہے، نہ ہی ہر کوئی اس کا اہل ہوتا ہے۔

یہ بھی ان کی سعادت تھی کہ انہوں نے ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ (۹ نومبر ۱۸۷۷ء) بروز جمعہ شیخ نور محمد کے گھر کے ایک حُجرے میں اس وقت آ نکھ کھولی تھی جب سیالکوٹ کی فضاؤں میں ابھی فجر کی اذانوں کی صدا محفوظ و مامون تھی اور برس ہا برس کے سفر کے بعد جب وہ اپنے خالق حقیقی کی طرف لوٹے تو انہیں پھر فجر کے مبارک وقت اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے کا موقع ملا۔ ۲۱ /اپریل ۱۹۳۸ء کی اس صبح جب ان کے رفیق رات بھر فکر مندی کی حالت میں ان کے قریب بیٹھے رہنے کی بعد فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے اقبال منزل کے قریب ہی واقع مسجد میں گئے تو اس صاحب بینا نے اپنے آ خری سفر پر روانگی سے قبل ایک لفظ کہا جس نے ان کی قوسِ زندگی کو مکمل کر دیا: ''اللہ''

یوں دو صبحوں کے درمیان پھیلی اس زندگی کی تقویمی سرحدوں کو متعین کرتے ہوئے ہمیں اس امر کو نظر اِنداز نہیں کرنا چاہیے کہ افراد کی لابُدی طور پر محدود زندگی کے کچھ دراُس جاوداں جہانِ فکر و جذب کی طرف بھی کُھلتے ہیں جو ازل سے ایک بحرِ بے کنار کی طرح نسلِ انسانی کے ہمراہ موجود ہے اور جس کے پانیوں سے حصہ پانے والے گویا خود اس جاودانی حیات سے وابستہ ہو جاتے ہیں جو نسل بہ نسل انسانوں کو آ دم علیہ السلام کی اساس سے منسلک رکھتی ہے۔ یہی وہ بحرِ بے کنار ہے جو کبھی جذب و جوش اور شوقِ نمو سے نفسِ انسانی میں ایسی

پاکیزگی اور ارتکاز پیدا کر دیتا ہے کہ وہ خود انھی سرمدی پانیوں کا حصہ بن جاتا ہے۔ اسی بحرِ ناپید میں زندگی کے شب و روز بسر کرنے والے نفوس اپنے سفرِ زندگی کا ایک ایسا احوال ہمارے لیے چھوڑ جاتے ہیں جو ہمیں اپنی محدودیّت اور چھوٹے چھوٹے تفکّرات سے نکال کر ان سرمدی پانیوں میں جذب ہو جانے کی دعوت دیتا ہے جس نے خود ان کی زندگیوں کو معنی عطا کئے تھے۔ کلام اقبال ایک بے حد مرتکز نفسِ پاکیزہ کے مدوجزر کا ایسا ہی احوال ہے جو اُنیسویں اور بیسویں صدی کے مہ و سال پر پھیلی ایک ایسی حیات کی تخلیق ہے جس نے اپنے باطن میں ابدی اور ازلی سچائیوں کو تلاش کرتے کرتے اپنے آپ کو اس ملت میں جذب کر دیا تھا جس کے بغیر اسے اپنے وجود کے کوئی معنی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔

فرد اور ملّت کا یہ ربط جو کلامِ اقبال میں مختلف انداز میں بار بار پرکھا جاتا تھا محض ایک انفرادی رغبت کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اقبال نے ملّتِ اسلامیہ کے لیے اپنے وجود کے انداز اس بے پایاں محبت کو اُس اصلی سرچشمے سے اخذ کیا تھا جو تمام عمر ان کی توجہ کا مرکز رہا تھا اور جس کی آیات نے ان کی زندگی اور ان کے کلام کی تدوین و تہذیب کی تھی۔ قرآن حکیم سے یہ وابستگی اتفاقی نہ تھی، بیان ہے کہ خانوادہ اقبال میں دلوں کو صیقل کرنے والے اس کلام کے واسطے اپنے آپ کو مخصوص کر دینے کی باقاعدہ روایت موجود تھی۔ لیکن اللہ کے کلام کے لحن اور معنی کو یوں اپنی ذات کا حصہ بنا لینے کا اعزاز اقبال ہی کے حصے میں آیا۔ بہر طور اس بے پایاں محبت اور جذباتی وابستگی کا محرک کوئی بھی ہو، حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ صدی میں عالمِ اسلام میں کوئی اور ایسا نابغہ نظر نہیں آتا جس کے تفکّر اور اِرتکاز نے ملّتِ مُسلِمَہ سے اُس کے ربط کو ایسی پاکیزگی اور طہارت عطا کی ہو کہ اس کے کلام میں الہامی شکوہ اور جلال پیدا ہو گیا ہو۔

اگر کلام اللہ سے عمر بھر کی رفاقت اور وابستگی نے اقبال کی زندگی اور ان کے فن کو ایک روحانی سرچشمے سے فیض یاب ہونے کا موقع دیا تو حُبِّ رسول ﷺ نے ان کے اندر ایسا سوز پیدا کیا کہ بیان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام دائرہ سماعت میں آتے ہی ان پر رقّت طاری ہو جاتی تھی۔ اسی محبت کا ایک رُخ شہرِ نبیؐ کی زیارت کی وہ خواہش تھی جو اقبال صرف عالمِ خیال ہی میں پوری کر سکے لیکن چشمِ تصور سے کئے گئے اس سفر کی اٹھان کیسی ہے کہ آوازِ جرس سے ان کی جان میں ایسا شور برپا ہو جاتا ہے جیسے وہ ہر لمحے شہرِ محبوبؐ کی طرف جانے والے قافلے کے ہمراہ پابہ رکاب ہوں۔ کیسی وارفتگی ہے اور حُبِّ رسولؐ کی یہ کیسی عجیب حکایت ہے کہ مُہارِ ناقہ کو چھوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ اس کا دل بھی مسافر کے دل کی طرح طلسمِ محبت کا اسیر ہو چکا ہے۔

''ارمغانِ حجاز'' فارسی اور اردو کلام کا آخری مجموعہ جو اقبال کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جانے کے بعد نومبر ۳۸ء میں شائع ہوا، گویا اس عجیب و غریب سفرِ ذات کا تکملہ ہے جو اس فقیرِ صحراء نے شرق و غرب کی تہذیبوں اور فلسفوں اور طرزہائے زیست کو کھنگالنے کے بعد رقم کیا۔ ان کے ہم عصروں میں حق کی راہ پر سفر کرنے والا شاذ ہی کوئی فرد ایسا نکلے جو سچائی کی تلاش میں تحقیق و تنقید کے اتنے مراحل سے باسلامتی گزرا ہو جتنے اس مردِ دانا صفت نے طے کئے؛ سیالکوٹ اور کیمبرج کے درمیان نہ صرف مکانی بُعد ہے، ان دونوں کے درمیان صدیوں کا تہذیبی فاصلہ بھی ہے۔ لیکن اس سارے سفر میں اقبال نے حق کا دامن چھوڑا نہ سرِ بازار برپا

نیلامی میں حصہ لیا۔ ایک عجب درویشی تھی جس نے اس مردِ حق آ گاہ کو ہر جال کی گرفت سے آ زاد رکھا۔ انھوں نے اسمبلیوں کی رکنیت بھی حاصل کی اور سر زمین فرنگ میں کانفرنسوں میں بھی حصہ لیا۔ وہ بے پناہ محبتوں کے درمیان بھی رہے اور سرد بے مہر لوگوں کے درمیان بھی، انھوں نے علمی حلقوں میں بھی شمولیت اختیار کی اور فکر وفن کی دنیا میں بھی سفر کیا۔ وہ قلب کی ہزار ہا پرتوں سے حملہ کرنے والی کیفیتوں سے بھی گزرے اور فکر کے میدان میں عربی اور عجمی علوم سے بھی فیض یاب ہوئے۔ لیکن یہ سارا سفر انھوں نے کلام اللہ کی معیّت میں کیا اور ہر مقام، ہر علم اور ہر کیفیت کو اسی میزان پر جانچا۔ یہی وہ ترازو تھا جس نے آخری وقت تک انھیں اپنے سفرِ ذات سے منسلک رکھا؛ نہ دنیاوی جاہ وحشم نے اس ارتکاز کو منتشر کیا نہ مایوسی اور بے بسی نے انھیں مغلوب کیا۔

یہ روشنی محض اس داخلی بصیرت کا نتیجہ تھی جو قرآن کے تفکر سے پیدا ہوئی ہے ورنہ ان کے قلب پر جو بوجھ تھا اور جس سُوز وحُزن سے انھیں واسطہ تھا، وہ بڑے سے بڑے بہادر کو زیر کرنے کے لیے کافی تھا کہ آخر وہ ایک ایسے دور میں زندگی گزار رہے تھے جب نگہبانِ حرم معمار دیر بن چکے تھے۔ حتیٰ کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ چراغ، جو دل میں عشق کو روشن رکھتا ہے، بجھ چکا ہے۔ ایسے قہرناک اندھیرے میں اپنی خاک میں شرر کو باقی رکھنا اور دوسروں کو عمل پر ابھارنا آسان نہ تھا۔

ایک بے سوز عصر میں، جب ملّتِ اسلامیہ کی محکومی نے انہیں مشرق ومغرب میں تنہا اور اجنبی بنا رکھا تھا، اقبال نے نہ صرف اپنے داخل کو مایوسی سے محفوظ رکھا بلکہ دوسروں کو بھی ایک عہد نو کی نوید دی۔ ان کی زندگی سرتا سر ملّتِ مُسلِمَہ کے لیے وقف تھی۔ یہ وابستگی ابتداء میں کچھ بھی رہی ہو، لیکن اپنی مکمل حالت میں صرف اور صرف ہمہ گیر عالمی تناظر رکھتی تھی؛ قومیّت اور نسلی عصبیت کا اس میں کوئی شائبہ باقی نہ رہا تھا۔ یہ بات محض اندھی عقیدت کے سبب نہیں کہی جا رہی، اقبال کے خطوط، ان کی وہ تحریریں اور اشعار جن میں انھوں نے قومیّت، بمعنی نیشنلزم پر بحث کی ہے اور ان کا اصرار کہ ملّتِ مُسلِمَہ صرف اور صرف جغرافیائی حدود کو پاش پاش کر کے اپنی جائز بلوغت اور کمال کو پہنچ سکتی ہے، اس کے شاہد ہیں کہ اس مردِ حق آ گاہ نے وحی کی بنیاد پر وجود میں آنے والے فرق کو واضح طور پر پہچان لیا تھا جو حزبُ اللہ کو حزبُ الشَّیطان سے ممیّز کرتا ہے۔ اقبال نے واضح طور پر دیکھ لیا تھا کہ عالمِ اسلام کے اجتماعی مستقبل کا تعلق اسی اصولی بحث پر ہے کہ بحیثیت مجموعی وہ ایک وحدت ہیں یا متفرق اقوام کا مجموعہ۔ یہی وہ ہمہ گیر عالمی مسئلہ ہے جس سے آج ملّتِ اسلامیہ دوچار ہے۔ اس وجہ سے اس موضوع کی اہمیت بے پناہ ہے۔

''اسلام سے پہلے قوموں کی تشکیل جس اصول پر ہو رہی تھی، اسلام نے اسے تسلیم نہیں کیا اور آج بھی وہ اصول جسے بنائے قومیّت ٹھہرایا جاتا ہے ہمارے لیے قابلِ تسلیم نہیں''۔ یہ الفاظ بسترِ بیماری سے ادا ہوئے تھے لیکن ان میں علمِ واثق اور یقینِ محکم کی گونج ہے: ''میں وطنی قومیّت کا وجود تسلیم نہیں کرتا۔ وطنی قومیّت کا تصور اسلام کے خلاف ہے''۔

فکرِ اقبال کا یہی پہلو ہے جو آج سب سے زیادہ اہم ہے۔ یعنی یہ کہ ایک عالمی اِستعمار کے مقابلے میں بُری طرح منقسم ملّت کی شیرازہ بندی کیسے کی جائے؟ وہ کون سی بنیاد ہے جس پر ایک وحدت کی عمارت

تعمیر کی جائے جو مسلمانانِ عالم کو ایک ملّت کا جُزو بنا دے، ایک ایسی ملّت جو اپنے وجود کے لیے صرف اور صرف قرآن حکیم سے زندگی اور روشنی اخذ کرے۔ اساسی طور پر یہ سوال کتاب اللہ میں اٹھایا گیا تھا اور وہیں اس کا جواب بھی فراہم کر دیا گیا تھا اور وہی اقبال کی فکر کا منبع بھی ہے۔ گو اقوام اور قبائل کا وجود، بلکہ ضرورت، قرآنی تعلیمات کا حصّہ ہے لیکن بنی آدم کی تقسیم قرآن حکیم نے صرف ایک بنیاد پر کی ہے اور یہ وہی بنیاد ہے جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ بنی نوعِ انسان توحید (اور اس سے منسلکہ عقائد) اور شرک (اور اس سے منسلکہ عقائد) کی بنیاد پر دو مختلف گروہوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ ایک گروہ حزبُ اللہ ہے اور دوسرا گروہ حزبُ الشّیطان۔ یہ بنیادی اور اساسی تقسیم ہے، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ما بہ الامتیاز ہے، یا تو ثانوی ہے یا باطل۔ یہ حقیقت ازل سے قائم ہے اور ابد تک رہے گی۔ انسانوں کا وہ گروہ جو توحید اور اس کے لازمات کو ماننے والا ہے ایک روحانی، سیاسی، سماجی اور فکری وَحدَت کا حِصّہ ہے جو ملّتِ مُسلِمَہ کہلاتی ہے۔ اس اُمّت کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ ایک دوسری اُمّت ہے۔ یہ وہ بنیادی امتیاز ہے جسے مٹانے کے لیے ہر دور میں داخلی اور خارجی کوششیں کی گئیں اور جسے ملیامیٹ کرنے کے لیے آج بھی کوششیں کی جارہی ہیں۔ یہی وہ امتیاز ہے جس کا شعور عالمِ اسلام کو پھر سے ایک مدنی وحدت بنا سکتا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر تعمیر ہونے والی سیاسی وحدت آج استعمار کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتی ہے۔ یہی وہ پُر شُکوہ، انقلاب خیز پیغام ہے جس نے اقبال کے کلام میں شُکُوہ اور جلال پیدا کیا تھا کیونکہ یہ حق پر قائم تھا اور حق ہمیشہ پُر شُکوہ، باجلال اور بارعب ہوتا ہے۔

الفاظ کا وہ دھارا جو کلامِ اقبال کو اس کی جائز ہیبت عطا کرتا ہے، کل کی طرح آج بھی ملّتِ اسلامیہ کے لیے تازیانہ ثابت ہوسکتا ہے۔ آج بھی اس میں حرارتِ ایمانی کا وہی شرارہ رقصاں ہے جس سے دلوں میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور جس نے گزشتہ صدی میں برصغیر کے مسلمانوں کو عمل پر آمادہ کیا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب مسلمانوں کی جِد وجُہد محض برصغیر تک محدود نہیں رہی بلکہ اب اس کا محور پورا کرہ ارض ہے، سمرقند سے ارضِ فلسطین تک ہماری ساری زمینیں ہمیں پکارتی ہیں کہ ہم پھر سے اسی نُور کی روشنی سے منور ہو کر اس کابُوسی اندھیرے کو تار تار کر دیں جو آج ہماری زمینوں کو تیزی سے ہڑپ کرتا چلا جارہا ہے، جس نُور نے اقبال کے باطن کو روشن رکھا تھا۔